مطبوعات

تاریخ فلسفۂ اسلام | تالیف ٹ ۔ ج ۔ دو بوئر فرانسوی ۔ ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پروفیسر فلسفہ و تعلیمات جامعہ ملیہ اسلامیہ ضخامت ۱۰۰ صفحات قیمت عـــہ ۔ مکتبۂ جامعہ دہلی ۔

اس کتاب کو فلسفۂ اسلام کی "تاریخ" کسی معنی میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ آسے تاریخ فلسفۂ اسلام پر ایک "تبصرہ" کہہ سکتے ہیں، اور علمی حیثیت سے لفظ "تبصرہ" جو وزن رکھتا ہے اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ کتاب اس معزز نام سے بھی موسوم ہونے کے لائق نہیں۔ پوری کتاب کو بالاستیعاب پڑھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مصنف نے فلاسفہ و متکلمین اسلام کی اصل کتابوں کو دیکھا ہی نہیں، یا اگر دیکھا بھی ہے تو بغیر کسی نظم و ترتیب کے ایک آدہ کتاب ادھر سے اور ایک آدہ ادھر سے سرسری طور پر دیکھ لی ہے جو ہرگز کسی سائنٹفک مطالعہ کے لیے کافی نہیں۔ اس کی معلومات تمام تر مستعار ہیں مختلف مغربی مصنفین نے فلسفۂ اسلام پر جو تبصرے لکھے ہیں، ان کو جمع کر کے اس نے اپنے ذہن میں ایک مرقع تیار کر لیا ہے اور اسی مرقع کو وہ ہمارے سامنے "تاریخ فلسفۂ اسلام" کے باوقعت نام سے پیش کرتا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ ایک سچے محقق کی طرح وہ اپنے ذہن کو غیر علمی مسلمات اور مشہورات اور توہمات سے صاف کر کے، حقائق کو جیسے کہ وہ فی نفسہ ہیں، دیکھنے اور سمجھنے کے لیے مستعد نہیں کرتا، بلکہ جو عام غلط فہمیاں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اہل فرنگ میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو حقائق کی حیثیت سے قبول کر لیتا ہے اور انہی پر اپنے نظریات کی بنا رکھتا ہے۔ اس نے بغیر کسی تحقیق کے یہ فرض کر لیا ہے کہ اسلام چونکہ ایک امی قوم میں پیدا ہوا ہے، اور ایک امی ہی نے اس کی بنا رکھی ہے (یہ لوگ محمد عربی صلعم کو اسلام کا "بانی" ہی سمجھتے ہیں) اس لیے "علم" سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ہو سکتا

کسی "علمی" بیداری یا کسی علمی تحریک کا اس کے لٹریچر اور اس کی تاریخ میں کھوج لگانا ہی عبث ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جب مسلمانوں میں "علم" آئے گا ——— اور وہ بہرحال باہر ہی سے آئے گا ——— تو اس کی زد سے وہ اپنے آپ کو نہ بچا سکے گا۔ یہ مصنف کا ایک بڑا مفروضہ ہے جو اس کے تبصرے کی عمارت میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کی کجی نے آخر تک پوری عمارت کو کج کر دیا ہے۔ ایک دوسرا مفروضہ جس کی حیثیت خشتِ ثانی کی ہے، یہ ہے کہ اہل مشرق فطری طور پر تنقید و تحقیق کی صلاحیت سے محروم ہیں، سائنٹیفک اصول پر حقائق کا سراغ لگانا اور ان کو مرتب کرنا ان کی افتادِ مزاج ہی کے خلاف ہے، اور اس باب میں "سامی ذہن" تو عام مشرقی ذہن کے مقابلہ میں بھی گیا گذرا ہے۔ ان دونوں مفروضات کی بنیاد پر "تاریخ فلسفۂ اسلام" کی یہ پوری داستان جو مصنف نے بیان کی ہے، افکارِ اسلام کے نشو و ارتقا کی ایک ایسی تصویر ناظرین کے سامنے پیش کرتی ہے جس کو دیکھ کر دو مختلف قسم کے آدمی دو مختلف قسم کے اثرات قبول کریں گے۔ جو شخص قبل اسلام اور دورِ اسلامی کی علمی تاریخ سے نابلد ہے وہ تو یہ سمجھے گا کہ علم کی شمع ہمیشہ "فرنگی دماغ" کی کارفرمائیوں سے روشن رہی ہے۔ زمانہ قدیم میں یونانی دماغ نے اس کو روشن کیا، اور زمانۂ جدید میں مغربی یورپ کی قوموں نے اس کو دیا سلائی دکھائی۔ بیچ کے دور میں اسلامی ذہن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نے یونانیوں سے جو کچھ لیا اسے بھی پوری طرح نہ سمجھا، اور فلسفہ کے نام سے محض غلط فہمیوں کا ایک انبار جمع کر دیا۔ بخلاف اس کے جو شخص علم رکھتا ہے، جس کی نظر میں علماءِ متقدمین اور حکمائے اسلام دونوں کے کارنامے موجود ہیں، وہ اپنے آپ کو یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور پائے گا کہ مصنف جس موضوع پر کلام کر رہا ہے، اس سے بحث کرنے کا وہ ہرگز اہل نہیں، نہ علمی حیثیت سے اور نہ ذہنی حیثیت سے۔

اس مختصر تنقید میں اتنی گنجائش نہیں کہ مصنف کی غلطیوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اس کی غلط فہمیوں اور دانستہ غلط بیانیوں کی توضیح کے لیے اتنی ہی بڑی ایک کتاب کی ضرورت ہے

مجملاً ہم صرف اتنا کہیں گے کہ جو شخص عربی علم نحو کی بنیاد کا سراغ یونانی اور عجمی علم اللسان میں تلاش کرتا ہو، جس کا خیال یہ ہو کہ قرآن کی صحت زبان ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں کو محاورے تراشنے کی ضرورت پیش آئی تھی، جس شخص کا مبلغ تحقیق یہ ہو کہ ابتدائی دور کے متکلمین نے "اختیار" کا عقیدہ مسیحی استادوں سے لیا تھا، جس شخص کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مسلمانوں کے مذاہب کلامیہ میں نظامیہ کے سوا کسی کا مذہب "طفرہ" کا قائل نہیں ہے، جو شخص سائنس کی پوری تاریخ سے آنکھیں بند کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہو کہ مسلمان سائنٹفک معلومات کے ذخیروں کو علمی طریقہ پر مدون و مرتب کرنا جانتے ہی نہ تھے، جو شخص ذکریا رازی کی تصانیف پڑھے بغیر یہ رائے زنی کرنے کی جرات کرتا ہو کہ اس نے ارسطو اور جالینوس کی کتابوں کو نہیں سمجھا، اور ساری عمر کیمیا گری میں گنوا دی، جو شخص ابن رشد پر یہ الزام لگاتا ہو کہ وہ اسلامی علم دین کو حقیر سمجھتا تھا، اور حقیقت اس کے نزدیک قرآن میں نہیں بلکہ ارسطو کی تصانیف میں تھی، ایسے شخص کو مشکل ہی سے اس کا اہل سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ "فلسفہ اسلام" جیسے اہم موضوع پر کلام کرسکے۔

حیرت یہ ہے کہ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کے مکتبہ سے یہ کتاب بغیر کسی تنقیدی مقدمہ اور بغیر کسی حاشیہ کے جوں کی توں شائع کر دی گئی۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے علوم و فنون اور اپنی تاریخ کے متعلق ہمیں دوسروں کی "تحقیقات" یا بیانات سے بھی واقف ہونے کی ضرورت ہے، اور اس لحاظ سے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں، بلکہ فائدہ ہی کا پہلو رکھتا ہے۔ مگر جب کہ ہماری زبان میں فلسفۂ اسلام کی معلومات کا ذخیرہ بمنزلہ صفر ہے، اور اردو داں طبقے کے لیے اُن ماخذ تک پہنچنا مشکل ہے جن کو دیکھے بغیر مغربی مصنفین کی غلط بیانیوں کا راز منکشف نہیں ہوسکتا، اس قسم کی کتاب کو بلا تنقید و تحشیہ شائع کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں نے ہماری جو غلط اور بھونڈی تصویر کھینچی ہے، اسے ہم خود اپنے ناواقف طالبان علم کے سامنے

پیش کریں اور انہیں یہ نہ بتائیں کہ تمہاری اصلی تصویر کیا ہے۔ اگرچہ فاضل مترجم نے اپنے دیباچہ میں بہت ذہبی زبان سے یہ تنبیہی فقرہ لکھدیا ہے کہ "یورپ کے مستشرقین کے لیے عربی غیر زبان ہے، اور وہ مشرقی خیال سے بیگانہ ہیں" اس لیے "اگر اس کتاب میں غلطیاں پائی جائیں تو جائے تعجب نہیں"، لیکن تریاق کی یہ ذرہ اسی چٹکی اس زہر کے مقابلہ میں کوئی اثر نہیں رکھتی جو اس کتاب کے مطالعہ سے، ناواقف اردو دان لوگوں میں پھیلیگا۔ فاضل مترجم کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ "اصل میں یہ کام خود مسلمانوں کا ہے کہ اپنے تمدن کے متعلق خود اپنی قوم کے لیے اور ساری دنیا کے لیے صحیح معلومات بہم پہنچائیں"، مگر جب وہ جامعہ بھی اس کام کو انجام نہ دے جو مسلمانوں کو مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، تو آخر ہم مسلمانوں کے اور کس طبقہ سے یہ امید رکھیں کہ وہ ہمارے تمدن کی صحیح نمائندگی کرے گا؟

ترجمہ کا نقش ثانی بلاشبہ نقش اول سے بہتر ہے۔ سات برس قبل جو ایڈیشن شائع ہوا تھا اس کے مقابلہ میں اب فاضل مترجم نے ترجمہ کو بہت زیادہ رواں، سلیس اور مفہم بنا دیا ہے تاہم اتنی اصلاح کے بعد بھی ترجمہ کو پڑھتے وقت اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ اسلامی فلسفہ کا بیان نہیں ہے مصنف اور مترجم دونوں اسلامی حکماء اور متکلمین کی اصل کتابوں پر نظر نہیں رکھتے، اسلیے ترجمہ در ترجمہ ہو کر ان کے خیالات کی صورت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ مترجم نے قدیم اصطلاحات کو چھوڑ کر نئی اصطلاحات وضع کی ہیں جن سے اجنبیت اور بڑھ گئی مثلاً (Categories) کے لیے قدیم اصطلاح "مقولات" ہے مترجم نے اس کو چھوڑ کر "ابواب" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ پرانی اصطلاح کے مقابلہ میں یہ نئی اصطلاح موزوں ہے یا نہیں علوم و فنون میں جو اصطلاحات رائج ہو چکی ہوں اور رواج کی قوت سے اپنے معانی موضوع لہا پر دلالت کرتی ہوں ان کو نئی اصطلاحات سے بدلنا بہرحال قابل احتراز ہے۔

(Sense-Organ) کا ترجمہ "الحاسّہ" درست نہیں۔ "عضو حاس" یا "آلہ احساس" یا صرف "حاس" کہنا چاہیئے۔ (Substantial) کے لیے قدیم اصطلاح "جوہری" ہے، اسے چھوڑ کر "جوہر آسا" کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ (activity) کے لیے "فعالی" کی اصطلاح درست نہیں۔ فعل اور فعلیت اور فاعلیت کی اصطلاحیں پہلے سے رائج ہیں۔ (Predestinatinoist) کے لیے "قدری" نہیں بلکہ "جبری" کی اصطلاح ہے۔ "قدری" اس کو کہتے ہیں جو انسان کے لیے "آزاد ارادہ" (free-will) کا قائل ہو۔ "متکثر" یا "متعدد" کے لیے مترجم نے "کثرت آسا" کی اصطلاح استعمال کی ہے جو بالکل غیر مانوس ہے۔ Phenomena کے لیے انہوں نے "مظاہر" کا لفظ پسند کیا ہے، مگر قدیم اصطلاح "آثار" ہے اور یہی لفظ قرآن میں بھی اس معنی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح "نوری" یا "نورانی" کے لیے "نور آسا" "احاطہ کے معنی میں "احصار"، "علم الاحکام" یا "فقہ" کے لیے "علم الفرائض"، "آن" کے لیے "غیر ممتد لمحہ" کی اصطلاحیں بھی نامناسب ہیں اور ان میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

A New Moslim World In Making تالیف حافظ فضل الرحمٰن انصاری بی۔ اے علیگ۔ شائع کردہ آل ملایا مسلم مشنری سوسائٹی، سنگاپور۔

فاضل مصنف مسلمان قوم کے ان نوجوانوں میں سے ہیں جن سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ابھی ان کا زمانہ طالب علمی ختم بھی نہیں ہوا ہے اور ابھی سے انہوں نے قابل قدر علمی خدمات انجام دینی شروع کر دی ہیں۔ اپنی اس تازہ تصنیف میں وہ عہد جدید کی تاریخ کا بالکل ایک نیا باب پیش کرتے ہیں جس کو آزلنڈ کی (Preaching of Islam) کا بہترین ضمیمہ کہا جا سکتا ہے۔ زمانہ حال میں اسلام اپنے پیروؤں کی مادی اور روحانی کمزوریوں کے باوجود جس طرح ایشیا، یورپ، افریقہ، امریکہ، اور کرۂ زمین کے بعید ترین جزائر میں پھیلا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے اس کی ایک مکمل تصویر آپ

اس کتاب میں نظر آئے گی۔ آپ اس میں دیکھیں گے کہ معمولی علم و عقل والے نہیں، بلکہ سلطنتوں کے سفراء، علوم جدیدہ کے ماہرین، اعلیٰ درجہ کے مصنفین اور اخبار نویس، حتیٰ کہ غیر مذاہب کے پیشوا اور مبلغین بھی جب اسلام سے روشناس ہوئے اور اس کی اصلی صورت ان کو نظر آگئی تو کس طرح وہ اس کے شیدائی ہو گئے، اور کس طرح انہوں نے اپنی زندگیوں کو اس دین کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا۔ اس قسم کی ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں مثالیں مصنف نے بیان کی ہیں اور ایک ایک ملک کو لے کر بتایا ہے کہ اسلام کی فتوحات کا دائرہ محض اپنی روحانی قوت سے کس طرح وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مصنف نے تفصیل کے ساتھ جماعت احمدیہ کی تبلیغی کارروائیوں پر بھی تبصرہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا ہے۔

مسلمان اور سائنس تالیف خان بہادر محمد ذکاء اللہ خان صاحب۔ ایم۔ اے۔ ریٹائرڈ کلکٹر و نائب ریاست دتیا قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ لطیفی پریس، دہلی۔

یہ کتاب اس سے پہلے مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ مگر وہ اشاعت ناقص تھی۔ اب مؤلف نے بہتر کتابت و طباعت کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کرا دیا ہے۔

فاضل مصنف ایک دردمند اور مخلص مسلمان ہیں۔ انہوں نے یہ رسالہ اس مقصد کے لیے لکھا ہے کہ علماء کرام کو قدیم نصاب تعلیم کی اصلاح، اور علوم جدیدہ، خصوصاً سائنس، کی تعلیم کی طرف توجہ دلائیں۔ یہ مقصد بجائے خود صحیح ہے، اور ضرورت ہے کہ عربی مدارس کے ارباب حل و عقد اس رسالہ کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کریں۔ لیکن ہمیں مصنف کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ علماء نفس علوم جدیدہ کے مخالف ہیں، اور ان علوم کو دہریت و الحاد پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مصنف کو غالباً معلوم ہوگا کہ علماء ہند کے سرخیل حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس زمانہ میں مسلمانوں کو علوم جدیدہ کی طرف توجہ دلائی تھی جب سرسید احمد خان شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے

اور ہندوستان میں کسی شخص کو اس ضرورت کا احساس نہ تھا۔ شاہ صاحب کی دور رس نگاہوں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان پر ایک حکیم قوم مسلط ہو رہی ہے اور حکیم کا مقابلہ حکمت ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے غدر سے پہلے دہلی کالج میں جب علوم جدیدہ کی ابتدائی تعلیم شروع ہوئی تھی تو علماء میں سے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء کو حکمت کی تعلیم سے کبھی اختلاف نہ تھا نہ آج ہے۔ اصل چیز جس کے وہ مخالف تھے اور آج بھی مخالفت پر مجبور ہیں، وہ طرز تعلیم ہے جو انگریزی حکومت نے اپنی اغراض کے لیے رائج کیا ہے۔ ابتداءً جدید تعلیم تمام تر عیسائی مشنریوں کے ہاتھ میں تھی، اور سرکار برطانیہ کی سرپرستی میں انہوں نے بیسیوں زنانہ و مردانہ تعلیمگاہیں صرف اس غرض کے لیے جاری کی تھیں کہ اگر ہندوستان کے لوگوں کو عیسائی نہ بنایا جا سکے، تو کم از کم اپنے مذہب اور اپنی تہذیب سے بیگانہ بنا دیا جائے، اور ان کے دلوں میں فرنگی تہذیب کی عظمت اور فرنگی اقتدار کی غلامی کا گہرا نقش بٹھا دیا جائے۔ اس کے بعد جب خود حکومت نے تعلیم کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تو جدید تعلیمی پالیسی کا سنگ بنیاد میکالے کے اس تخیل پر رکھا گیا کہ اس سے ایک ایسی قوم پیدا ہو گی "جو رنگ اور خون کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو گی، مگر مذاق، خیالات، اخلاق اور ذہنیت کے اعتبار سے انگریز ہو گی"۔ اس پالیسی کے تحت جتنے مدارس اور کالج قائم ہوئے ان کا اصل مقصد باشندگان ہند کو زیور علم سے آراستہ کرنا نہ تھا بلکہ ان کے دل و دماغ کو انگریزی اقتدار کی غلامی کے لیے تیار کرنا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ ان تعلیمگاہوں میں مسلمانوں کے خلاف تو ایسی سخت زہریلی فضا پیدا کی گئی تھی کہ کوئی خوددار مسلمان اس میں سانس نہ لے سکتا تھا۔ ان کے اسلاف پر تبرا بھیجا جاتا تھا۔ ان کے مذہب کی توہین کی جاتی تھی۔ ان کے عقائد کی تردید ہوتی تھی۔ ان کی تہذیب کا مذاق اڑایا جاتا تھا؛ اور اس کے ساتھ ہر ممکن ذریعہ سے کوشش کی جاتی تھی کہ اسلامی علوم و فنون دنیا سے مٹ جائیں، عربی و فارسی کی تعلیم بند ہو، اور اسلامی علوم پڑھنے والوں

کے لیے رزق کے دروازے مسدود ہو جائیں۔ کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ علماء اس تعلیمی پالیسی کی مخالفت کرنے میں حق بجانب نہ تھے؟

انیسویں صدی کے آخر میں جدید تعلیم کی اشاعت کے لیے جو تحریک خود مسلمانوں کی طرف سے اٹھی اس کے دنیوی اور مادی فوائد سے کسی کو انکار نہیں، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو طرز تعلیم علیگڑھ اور دوسری اسلامی درسگاہوں میں اختیار کیا گیا وہ ایک خفیف سی ترمیم کے ساتھ اسی طرز تعلیم کا چربہ تھا جو انگریزی حکومت نے رائج کیا تھا۔ اس کی مخالفت علماء نے اس بنا پر کبھی نہیں کی کہ انگریزی زبان کیوں پڑھائی جاتی ہے، یا علوم جدیدہ کی تعلیم کیوں دی جاتی ہے۔ بلکہ مخالفت کا اصلی سبب یہ تھا کہ اس میں انگریزی زبان کے ساتھ فرنگی ذہنیت بھی بطور جزو لازم کے شریک کی گئی، اور علوم جدیدہ کی تعلیم میں وہی نقطۂ نظر اختیار کیا گیا جو انگریزی حکومت کی رائج کردہ تعلیم میں اساس و اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ فاضل مصنف کی طرح ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ علوم جدیدہ میں سے کوئی علم بھی ایسا نہیں جو اسلام کا مخالف ہو۔ طبیعیات، کیمیا، ریاضی، ہیئت، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم، حتیٰ کہ فلسفہ میں بھی کوئی ثابت شدہ حقیقت ایسی نہیں ہے جو اسلام کے اصول و فروع میں سے کسی کی تردید کرتی ہو، بلکہ اس کے برعکس یہ سب علوم دراصل مسلمان کے ایمان میں اضافہ کرنے والے اور اسکو خلافت الٰہی کے فرائض کی بجا آوری میں مدد دینے والے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جدید درسگاہوں میں ——— خواہ وہ قومی ہوں یا سرکاری ——— ان علوم کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹۵ فی صدی مسلمان طلبہ کی مت کیوں پلٹ جاتی ہے؟ وہ ہندوستانی مسلمان سے یکایک "صاحب بہادر" کیوں بن جاتے ہیں؟ ان کی لڑکیاں خاتون مشرق سے یکلخت "میم صاحب" کیوں بن جاتی ہیں؟ ان کی زبان، ان کے لباس، ان کی معاشرت، ان کے عادات و اطوار پر فرنگیت کیوں مسلط ہو جاتی ہے؟ ان کے دماغ اپنے دین کی صداقت میں کیوں شک کرنے لگتے ہیں؟ ان کے

اندر حدود شریعت سے آزادی کا مرض کیوں پیدا ہو جاتا ہے؟ وہ نماز سے کیوں گریزاں ہوتے ہیں؟ رمضان میں علانیہ کھانے پینے اور سگریٹ کے دھوئیں اڑانے کی جرأت ان میں کیوں پیدا ہوتی ہے؟ شعائر اسلامی کا مذاق اڑانے اور عقائد اسلامی کے خلاف زبان کھولنے پر وہ کیوں جری ہو جاتے ہیں؟ آخر وہ کونسی چیز ہے جو طبیعیات اور فلسفہ کے طالب علم کو دہریہ بناتی ہے؟ عمرانیات کے طالب علم کو اسلام سے ہٹا کر سرمایہ داری یا اشتراکیت کی طرف لے جاتی ہے؟ تاریخ و سیاسیات کے طالب علم کو رنگ و نسل و وطن کی پرستش کا سبق سکھاتی ہے؟ قانون کے طالب علم کو اسلامی قوانین میں جاہلانہ ترمیمیں کرنے پر آمادہ کرتی ہے؟ اور مشترک طور پر تمام علوم جدیدہ کے طالب علموں میں یہ مرض تھوڑا یا بہت پیدا کر دیتی ہے کہ ان پر زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر غالب ہو جاتا ہے اور وہ ہر چیز کی قدر مادی منفعتوں اور حسی لذتوں کے لحاظ سے متعین کرنے لگتے ہیں؟ اگر آپ حکیمانہ نظر سے ان خرابیوں کے اسباب کا تجسس کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یہ محض سطح کا میل نہیں ہے جو اوپر سے مسلمان نوجوانوں کو لگ جاتا ہو بلکہ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ اس غلط طرز تعلیم اور ناقص طریق تربیت میں نشو و نما پا رہی ہیں جو علوم جدیدہ کی تعلیم کے لیے اختیار کیا گیا ہے، اور جس میں اسلامی تعلیم و تربیت کا کوئی عنصر شامل نہیں ہے۔ علماء اگر اس کی مخالفت کرتے ہیں تو کوئی گناہ نہیں کرتے، بلکہ وہ اسلام کے دشمن ہوں گے اگر اس کی حمایت کریں گے۔

پس درحقیقت علماء پر اس حیثیت سے کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ علوم جدیدہ کی تعلیم کے موجودہ طرز کے مخالف ہیں، بلکہ ان پر الزام ایک دوسری حیثیت سے عائد ہوتا ہے۔ وہ اس بنا پر ملزم اور سخت ملزم ہیں کہ زمانہ کی ضروریات کو سمجھنے اور قدیم طرز تعلیم کو ان کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ انہوں نے اپنے اردگرد ساتویں صدی ہجری کی فضا طاری کر رکھی ہے جس میں العالم متغیر وکل متغیر حادث کا سبق تو روز دیا جاتا ہے مگر اس کی حقیقت

تسلیم کرنے سے ہر آن انکار کیا جاتا ہے۔ وہ آج تک اُن فرق باطلہ کا رد کیے جا رہے ہیں جو اب دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں، اور آج جو نئی گمراہیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو سمجھنے تک کی اہلیت اپنے اندر پیدا نہیں کرتے، کجا کہ ان کا رد کر سکیں۔ ان کی زبان پرانی، ان کے خیالات پرانے، ان کی حجتیں پرانی، ان کی حرکات و سکنات پرانی، غرض مجموعی حیثیت سے وہ خود اس قدر پرانے ہیں کہ دنیا آج ان کو آثار قدیمہ میں شمار کرنے پر مجبور ہے۔ جدید زمانے کی زندگی میں وہ اس کے سوا کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتے کہ لوگ ان کو اسلام کا نمائندہ سمجھ کر خود اسلام سے بدگمان ہو جائیں۔ ان میں اتنی ایسے لوگ موجود ہیں جو اخبار تک پڑھنا پسند نہیں کرتے کہ مبادا العالم متغیر کی حقیقت ان پر منکشف نہ ہو جائے۔ فاضل مصنف تو ان پر صرف علوم جدیدہ سے ناواقفیت کا الزام لگاتے ہیں، مگر میں کہتا ہوں کہ خود اسلامی علوم کی تعلیم بھی جو ان کے مدرسوں میں دی جا رہی ہے، شدت کیساتھ محتاج اصلاح ہے۔ درحقیقت وہ اس قدر ناقص ہے کہ اس کے انتہائی مدارج پر پہنچ کر بھی انسان روح اسلامی سے بیگانہ رہتا ہے، اور اس میں اسلام کو سمجھنے تک کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی، کجا کہ وہ دنیا کے سامنے اسلام کی نمائندگی کر سکے۔ اس طرز تعلیم کے نقائص بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔ اگر خدا کی توفیق شامل حال رہی تو انشاء اللہ ایک مستقل مضمون عربی مدارس کی تعلیم پر بھی اسی طرح لکھا جائے گا جس طرح علیگڈھ یونیورسٹی کی تعلیم پر لکھا جا چکا ہے۔

خاتمہ تالیف حضرت سید محمد گیسو دراز چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ۔ مولوی سید عطا حسین صاحب ایم۔ اے۔ سی، ای، لنگم پلی۔ حیدرآباد دکن۔

"آداب المریدین" تصوف کی مشہور کتابوں میں سے ہے حضرت خواجہ گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تین شرحیں لکھی تھیں، اور ان میں سے ایک شرح کے آخر میں تکملہ یا ضمیمہ کے طور پر یہ رسالہ تحریر فرمایا تھا جس کا نام "خاتمہ" ہے۔ اس میں حضرت نے تفصیل کے ساتھ وہ ہدایتیں درج فرمائی

ہیں جنھیں ایک طالب حق کو تعلیم سلوک کے دوران میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مدتوں سے یہ رسالہ گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا تھا۔ مولوی سید عطا حسین صاحب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسے جدید طرز پر ایڈٹ کرکے شائع کر دیا۔

تصوف جس علم اور جس عمل کا نام ہے اس کی صحیح تصویر اگر آپ کو دیکھنی ہو تو ان اکابر اولیاء اللہ کی تصانیف دیکھیے جو اس علم و عمل کے حقیقی نمائندے ہیں۔

عورت تالیف جناب مرزا حسین احمد بیگ صاحب زائد سشن جج گلبرگہ۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات قیمت (عہ) ملنے کا پتہ: مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن۔

جدید مغربی تہذیب میں عورت اور مرد کا فطری توازن بگڑ جانے کی وجہ سے تمدن و معاشرت میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کو فاضل مؤلف نے ایک حد تک تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے پوری کتاب عدالتی مقدمات اور معتبر کتابوں اور رسالوں کے شواہد سے بھری ہوئی ہے۔ خود مؤلف یورپ کی سیاحت کر چکے ہیں اور انہوں نے اپنے ذاتی مشاہدات بھی بیان کیے ہیں۔ جو لوگ صنفی معاملات میں یورپ کی اندھی تقلید پر مائل ہیں انھیں خصوصیت کے ساتھ اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ افسوس کہ اس کتاب کی ترتیب زیادہ اچھی نہیں ہے، مؤلف نے مختلف عنوانات کے تحت واقعات کو محض جمع کر دینے پر اکتفا کیا ہے۔ واقعات کے درمیان کوئی فلسفیانہ ربط پیدا نہیں کیا جس سے ذہن آسانی کے ساتھ نتائج اخذ کر سکے۔ تاہم واقعات بہت سبق آموز ہیں، اور ان کو پڑھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ یہ مغربی تہذیب انسان کو کدھر لے جا رہی ہے۔

فصل الخطاب تالیف جناب اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت مجلد (عہ) غیر مجلد ۱۲ ملنے کا پتہ:۔ منیجر مکتبہ عبرت، نجیب آباد (یوپی)۔

آج کل پنجاب میں دو مختلف سمتوں سے امارت کا ایک ہی نظریہ پیش کیا جا رہا ہے جو سراسر غیر اسلامی

ہے، مگر مسلمانوں کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے اس کو اسلامی لباس پہنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ میں امیر کی حیثیت "مطاعِ مطلق" کی ہے۔ جس طرح نبی قوم کے سامنے جواب دہ نہیں ہے اسی طرح نبی کا نائب بھی جواب دہی سے مبرّا ہے۔ اور اس کے کسی حکم اور کسی قول و فعل پر تنقید نہیں کی جا سکتی قوم کا کام صرف اس کی اطاعت ہے، بے چون و چرا اطاعت، ویسی ہی اطاعت جیسی نبی کی کرنی چاہیے۔ اس نظریہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرآن مجید کی وہ آیت ہے جس میں اطاعت اولی الامر کا حکم دینے کے ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو جائے تو اس کو خدا اور رسول کی طرف پھیر دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو)۔ اس آیت کا صاف منشا یہ ہے کہ حق اور باطل کی تمیز کے لیے مسلمانوں کے پاس اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کا طریقہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک معیار ہے، اور یہ معیار اس قوم کو اسی لیے دیا گیا ہے کہ یہ اپنے جیسے انسانوں کو ارباباً من دون اللہ نہ بنائے، شخصیت پرستی میں مبتلا نہ ہو، کسی بڑے سے بڑے آدمی کی بھی اندھی تقلید اور کورانہ اطاعت نہ کرے، بلکہ ہر رہنما کی رہنمائی اور ہر حاکم کے حکم کو اس معیار پر جانچ کر دیکھتی رہے کہ آیا وہ حق کی طرف لے جا رہا ہے یا باطل کی طرف۔ مگر عبداللہ ابن سبا کے زمانہ سے آج تک تمام گمراہ فرقوں اور ضلالت کے داعیوں کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ سب سے پہلے اسی معیارِ حق پر ہاتھ صاف کرتے ہیں، کیونکہ اس کی موجودگی میں ان کا کاروبار کسی طرح چل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا جاتا ہے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کا طریقہ، جو مسلمانوں کے سامنے اسلامی زندگی کا حقیقی نمونہ ہے، یک قلم محو ہو جائے۔ اس کے بعد قرآن کی غلط تاویلات کی جاتی ہیں اور ایسے خوشنما طریقوں سے کی جاتی ہیں کہ ہر وہ مسلمان دھوکا کھا جائے

جو بچارا خود قرآن کا صحیح علم نہیں رکھتا پھر یہ خطرہ پیش آتا ہے کہ کہیں صحیح علم رکھنے والے اس فریب کا پردہ چاک نہ کردیں۔ تو اس کا سدباب کرنے کے لیے علما پر گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی ہے تاکہ قوم کی نگاہ میں ان لوگوں کو ساقط الاعتبار کر دیا جائے جو اس کو حقیقت سے خبردار کر سکتے ہوں، اور اس طرح قوم کے ناواقف لوگ آسانی کے ساتھ اس شخص کی مٹھی میں آجائیں جو ان پر اپنی کشش کا جال پھیلانا چاہتا ہو۔ مزید براں ایک چال یہ بھی اختیار کی گئی ہے کہ جو لوگ اس غلط رہنمائی پر تنقید کرتے ہیں ان کے جواب میں نہایت غیرمہذب اور غیر شریفانہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے تاکہ کوئی شریف آدمی جھربا زار اپنی پگڑی اچھلوانا پسند نہ کرتا ہوان گمراہ کن لوگوں کی کارروائیوں پر نکتہ چینی کی جرأت نہ کرسکے اور خاموشی کے ساتھ اپنی قوم کو ایک غلط راستہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا ہے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس قوم کا کیا حشر ہوگا جس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ خود اپنی قوم کی جہالت اور مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں مسلمان قوم کے کم ازکم ۹۵ فی صدی افراد قرآن وسنت کے صحیح علم سے بے بہرہ ہیں۔ یہ چیز ان لوگوں کے لیے ایک سرمایہ بن گئی ہے جو اس غریب قوم کے سروں پر اپنی کبریائی کا قصر تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان کا دوسرا سرمایہ اس قوم کی وہ مصیبت ہے جس میں یہ آج کل مبتلا ہے۔ بدنظمی وانتشار کے ہولناک نتائج نے ساری قوم کو ہراساں کر دیا ہے وہ تنظیم کی پیاسی ہو رہی ہے، اور اس پیاس نے اس کو اتنا بدحواس کر دیا ہے کہ تنظیم کا لیبل لگا کر زہر کا پیالہ بھی اگر اس کو دیا جائے تو دوڑ کر منہ سے لگانے گی۔ یہ دوسری چیز ہے جس سے خود غرض لوگ ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ (یعنی قادیانی) تو پہلے ہی ایک فرقہ بن چکا ہے جس کے زہریلے اثرات کو آج ہر صاحب عقل تمام مسلمان محسوس کر رہا ہے۔ اب دوسرا گروہ (یعنی خاکسار) اپنے اندر روز بروز وہ

خصوصیات پیدا کرتا جا رہا ہے جو بالآخر اس کو بھی ایک فرقہ اور جتھا بنا کر چھوڑ دیں گی۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے امارت کے ان دونوں قادیانی و خاکساری نظریوں کی تردید میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ و طریقۂ خلفاء راشدین سے بہترین دلائل مہیا کیے ہیں۔ ان کے جواب میں مخالفین کے پاس کوئی وزنی دلیل نہیں اس لیے انہی اوچھے ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے جو باطل کے حامیوں کا آخری سہارا ہیں۔ وہ بجز اس کے کوئی جوابی دلیل ــــ اگر اس کو دلیل کے با وقعت نام سے یاد کیا جا سکتا ہے پیش نہ کر سکے کہ اکبر شاہ کی تحریر میں "ملائیت" ہے اور "ان کا بڑا منشا کتابیں لکھنے سے کتابوں کی فروخت ہے" مقصد یہ ہے کہ لوگ اُس کتاب کی طرف سے پہلے ہی بدگمان ہو جائیں جو ان کو حقیقت حال سے آگاہ کر سکتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم امید رکھتے ہیں کہ خاکسار تحریک میں جو نیک نیت مخلص اور حقیقی اسلامی جذبہ رکھنے والے لوگ محض اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا داعیہ لیکر شریک ہوئے ہیں وہ تعصبات سے خالی الذہن ہو کر مولانا اکبر شاہ خاں کی اس کتاب کو دیکھیں گے، اور اس غیر اسلامی امارت کے وقتی فوائد سے قطع نظر کر کے اس کے دوررس نتائج و عواقب کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

تبصرہ بر تذکرہ نمبر ۱ و ۲ یہ دو رسالے ہیں جن میں عنایت اللہ خان صاحب مشرقی کی کتاب "تذکرہ" پر چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔ اے اور مولانا سید سلیمان ندوی کے تبصرے نقل کیے گئے ہیں۔ دونوں مضمون غایت درجہ سنجیدگی کے ساتھ لکھے گئے ہیں اور ان میں "تذکرہ" کی اساسی غلطیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ناشر نے مشرقی صاحب کے خلاف درشت کلامی اختیار کر کے ان تبصروں کی وقعت میں اضافہ کرنے کے بجائے اس کو اور گھٹا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ خود مشرقی صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات بھی درشت کلامی میں کسی سے

پیچھے نہیں ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ درشتی کا جواب درشتی سے دیا جائے جو لوگ درحقیقت مسلمانوں کو صحیح راستہ دکھانا چاہتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ نہایت متین لہجہ اختیار کریں، تاکہ مسلمان ٹھنڈے دل سے تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر رائے قائم کر سکیں۔

دونوں رسالے ۳ر کے ٹکٹ بھیج کر مہتمم دائرۃ الارشاد، چوک بابا اٹل، امرت سر سے منگائے جا سکتے ہیں۔

اسلام اور مرزائیت | تالیف مولوی عتیق الرحمن صاحب آروی۔ ضخامت ۳۲ صفحات قیمت ۳ر ملنے کا پتہ: مولوی عتیق احمد صاحب صدیقی مدیر قاسم العلوم۔ دیوبند۔

اس مختصر رسالہ میں مؤلف نے ایک طرف اسلام کے اصلی عقائد قرآن وحدیث سے جمع کئے ہیں۔ اور دوسری طرف قادیانی عقائد خود مرزا صاحب اور ان کے خلیفہ اور اکابر طائفہ کی تحریروں سے فراہم کر دیے ہیں تاکہ دونوں کا تقابل کر کے ہر طالب حق خود فیصلہ کرے کہ اسلام اور قادیانیت میں اصولاً کتنا بڑا فرق ہے، اور قادیانیت کو اسلام کا ایک فرقہ سمجھنا کہاں تک حق بجانب ہو سکتا ہے۔

سرکار کا دربار | تالیف مولوی الیاس احمد صاحب مجیبی۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ جامعہ دہلی۔

سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بہت سہل اور میٹھی زبان میں بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، اور ایسا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے جس سے بچوں کے دل پر سرکار اور یاران سرکار کی عظمت کا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ کتاب ہر مسلمان بچے کو پڑھائی جائے۔

نبوت اور نبی | یہ وہ خطبہ ہے جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب استاد فلسفہ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے یوم النبی کی تقریب پر یونیورسٹی کی مجلس اسلامیات کے سامنے پڑھا تھا۔ یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی کہ ہماری یونیورسٹی میں جو شخص فلسفہ کا پروفیسر ہے وہ ایک سچا اور صحیح العقیدہ مسلمان ہے، اور اپنے علم کو دہریت والحاد کے بجائے ایمان باللہ وایمان بالرسول کی خدمت میں استعمال کرتا ہے۔ فاضل خطیب نے اس مختصر سے خطبہ میں

دراصل دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ دیکھنے والے کے لیے الفاظ بہت کم ہیں مگر سمجھنے والے کے لیے معانی بہت زیادہ ہیں۔ ان کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے قلب کو ابتدا سے آج تک جس چیز نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مضطرب کیے رکھا ہے وہ اپنے کمالِ لائق کو پہنچنے کی خواہش ہے۔ سائنس فلسفہ اور شہود باطنی (Religious experience) کے ذریعہ سے انسان نے اپنے اس مطلوب تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ناکام ہوا۔ ان تینوں ذرائع کی ناکامی آج ہر صحیح النظر نقادہ پر روشن ہے۔ اب صرف ایک ہی ذریعہ جادۂ کمال کی دریافت کا باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وجود کامل خود اس وجود ناقص یعنی انسان کی طرف متوجہ ہو اور اس کو اپنی طرف آنے کا راستہ بتائے۔ یہی چیز ہے جس کو نبوت کہتے ہیں، اور درحقیقت راہ راست پانے کا کوئی ذریعہ نبی پر ایمان لانے اور اس کی پیروی کرنے کے سوا نہیں ہے۔ آگے چل کر خطیب فاضل نے بیان کیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی و نبوت کے کامل ترین مظہر ہیں۔ آپ کی لائی ہوئی کتاب اور آپ کی سیرت، آپ کی نبوت پر ایسی قطعی شہادت ہے کہ عقل سلیم کے لیے کسی شک کی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد وہ اس مسئلہ پر بحث کرتے ہیں کہ مذہب کو ایک انفرادی چیز سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ وہ محض انسان اور خدا کے درمیان ایک تعلق ہے، کس قدر غلط اور گمراہ کن تخیل ہے۔ ہدایت دراصل ہدایت ہی نہیں ہے اگر وہ انسان اور انسان کے تعلق کو درست کرنے کے لیے کوئی رہنمائی نہ پیش کرے۔

ہم اپنے ناظرین سے اس خطبہ کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ مجلس اسلامیات علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے غالباً مفت مل سکیگا۔

بصائر القرآن۔ جناب نکہت شاہجہانپوری۔ بی اے۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت ۴ر۔ مولف سے انجمن اسلامیہ ہائی اسکول بوری بندر بمبئی کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

یہ مختصر کتاب ان خطبات کا مجموعہ ہے جو جناب نکہت نے انجمن تحریک قرآنی کے جلسوں میں قرآن مجید

کی تعلیمات پر ارشاد فرمائے تھے۔ فاضل خطیب نے عقیدۂ توحید، مغفرت الٰہی رحمت الٰہی، اور قبالۂ اسلام کے عنوانات پر کلام کیا ہے اور ان کے تحت مسلمانوں کی بہت سی عام غلط فہمیوں کو دور کر کے اسلامی تعلیمات کی ایسی تشریح کی ہے جو موجودہ زمانہ کے روشن خیالوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ بعض بعض مقامات پر خطیب سے لغزشیں بھی ہوئی ہیں مثلاً وہ اللہ تعالیٰ کی صفت غفاری کو "جذبہ" سے تعبیر کرتے ہیں، اور شفاعت کو "خدا کے جذبۂ غفران سے اپیل" قرار دیتے ہیں۔ لفظ "جذبہ" جن معنوں میں عام طور پر مستعمل ہوتا ہے ان کے لحاظ سے حق تعالیٰ کی طرف اسے منسوب کرنا درست نہیں۔ اس کے بجائے "صفت" کی پرانی اصطلاح ہی کو استعمال کیا جاتا تو کیا مضائقہ تھا؟

آخری رسول | تالیف جناب ماہر القادری صاحب۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت ۴ر۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ علمیہ، چار مینار حیدر آباد دکن۔

جناب ماہر نے اس کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک بہت سادہ اور عام فہم زبان میں لکھی ہے مقصد یہ ہے کہ "مولود" کی بے اصل کتابوں کے بجائے اس قسم کی کتابوں کو رواج دیا جائے جن میں سیرت پاک کے صحیح حالات ہوں اور ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیمات پر بھی کچھ روشنی پڑتی جائے۔ کتاب بلاشبہ اس مقصد کیلیے مفید ہے، مگر بہتر ہوتا کہ عام مذاق کی رعایت ملحوظ رکھکر بیان کو زیادہ رنگین اور خطیبانہ کر دیا جاتا، اور بیچ بیچ میں نعتیہ اشعار بھی لائے جاتے۔ جناب ماہر یہ دونوں کام خوبی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ خصوصاً نعت کے باب میں عام مذاق جس قدر پست ہو گیا ہے اس کو بلند کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ ماہر جیسے قادر الکلام شاعر صحیح قسم کی نعتیں کہیں اور ان کو عام رواج دیا جائے۔

بعض مقامات پر مصنف نے جوش عقیدت میں نامناسب الفاظ استعمال کیے ہیں جنکی اصلاح ضروری ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جگہ جگہ شہنشاہ لکھا ہے، حالانکہ حضور نے خود اس لفظ کو غیر اللہ کے لیے استعمال کرنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ حضور کا چہرہ سورج سے زیادہ چمکیلا تھا اور آپکے پسینہ میں مشک و عنبر سے زیادہ خوشبو تھی۔ یہ محض ایک عقیدتمندانہ مبالغہ ہے، اور سرکار رسالتمآب کے محاسن و فضائل اس سے بالا و برتر ہیں کہ آپ کی فضیلت بیان کرنے کے لیے اس قسم کے مبالغوں کی ضرورت ہو۔ ترتیب واقعات میں بھی کچھ فروگذاشتیں رہ گئی ہیں مثلاً بادشاہوں کے نام آپکے دعوت ناموں کا ذکر فتح مکہ کے بعد کیا ہے، حالانکہ اس سے پہلے ہونا چاہیے تھا۔